نہ کوئی سلطنت غم ہے نہ اقلیم طرب: مجید امجد کے شعوری زاویے

ڈاکٹر سعادت سعید

Abstract:

In poetry, poets face their existence during their historical time. They explore analytically metaphysical and materialistic value patterns of their culture. Their epistemological and ontological studies give their poetry new ethical patterns which can influence their readers. Majeed Amjad one of the leading poet of our age, through his poems depicts his existential conclusions about universe, man and life. The writer of this article through philosophical theory of poetry has analyzed a long poem by Majeed Amjad. He concludes real poets by their positive attitudes can share crisis and mishaps of humanity at large.

مجید امجد کے تصور شعر میں زبان کی بنیادی اہمیت ہے۔ان کی استعاروں اور علامتوں سے بھری زبان کے کرشمے ''شب رفتہ'' اور ''شب رفتہ کے بعد'' جیسے ان کے مجموعوں میں شائع ہونے والے کلام میں دیکھے جا سکتے ہیں۔انہوں نے انسان، کائنات اور زندگی کو منفرد شعوری زاویوں سے پرکھا ہے۔انہوں نے اپنے وجود کے دکھوں اور مسائل کو وسیع تر معنوی تناظر میں رکھ کر دیکھا ہے۔ان کے سامنے اپنے زمانے کے دکھ بھی تھے اور اپنی ذات کے آلام بھی۔انہوں نے شاعرانہ تفکر سے کام لیتے ہوئے انسانی تجربے کا رابطہ بڑے ماورائی کینوس سے جوڑنے کا اہتمام کیا ہے۔یوں ان کی شاعری مخصوص ثقافتی زاویوں سے لے کر بڑے کائناتی زاویوں کو چھوتی دکھائی دیتی ہے۔

کائنات کے گھنا گھن گھومتے عالموں اور چھما چھم ناچتی صدیوں میں مجید امجد کے حصے میں بیسویں صدی کے ساٹھ برس آئے۔ان کی فکر کی کل کائنات ان کے باشعور ہونے سے لے کر ان کی موت کے لمحے تک محدود ہے۔ان کی شاعری میں موجود ان کے خیالات، تجربات، احساسات ، جذبات اور نظریات مذکورہ دائرے کے اندر ہی رہے ہیں۔ماضی ،حال اور مستقبل تک ان کی علمی، مشاہداتی اور تصوراتی رسائی کی بدولت ان کی شاعری کی وسعتوں کی حد بندی ہو سکتی ہے۔مجید امجدنے قدیم علمی روایات ، جدید سائنسی معلومات اور اپنی مستقبل بینی کے حوالے سے جس نوع کے شعری فکر کے چراغ روشن کیے وہ ان کی دو کتابوں، شب رفتہ اور شب رفتہ کے بعد میں اپنی تاب دکھا رہے ہیں۔انہوں نے اپنے عہد تک ہونے والی سائنسی ترقیوں اور دریافتوں پر گہری نظر رکھی۔کائنات، انسان اور زمین کے بارے میں قدیم و جدید تصورات سے وہ پورے طور آگاہ تھے۔ان کے شعری سفر میں قدیم مابعد الطبیعیات سے لے کر جدید مادی تصورات تک بہت کچھ دستیاب ہے۔مقام حیرت سے مقام تشکیک اور پھر مقام یقین تک ان کے خیالات ان کی نظموں میں بار پا چکے ہیں۔ان کے وسطی زمانے کی نظموں میں ایک نظم بعنوان ''نہ کوئی سلطنت غم ہے نہ اقلیم طرب '' بھی ہے ۱۔یہ نظم ان کے کائنات، انسان اور خدا کے تصورات کے حوالے سے انتہائی معنی خیز ہے۔

اس نظم کا ایک حصہ نغمہ کواکب کے عنوان سے بھی ہے۔اس میں کار جہاں کو بہتر بنانے کے لیے آسماں کی جانب رجوع کیا گیا ہے۔آسمان کہ جسے شاعروں نے کبھی نیلی چھتری کہا ہے ،کبھی عرش نشین کا ٹھکانا، کبھی تقدیر کی علامت۔کبھی انہوں نے اس کی وسعتوں اور فراخی کی جانب توجہ دلائی ہے اور کبھی اس کی محدودیت اور تنگی کی بات کی ہے۔فی الحقیقت یہ حد نظر ہے جس میں اربوں دنیائیں یا عوالم اپنی تنہائیوں اور پہنائیوں سمیت گرداں ہیں۔کبھی یہ دنیائیں فنا

ہو رہی ہیں اور کبھی وجود میں آ رہی ہیں۔'' نغمۂ کواکب''۲ کا آغاز دائموس سے ہوا ہے۔اس کے وسیلے سے دامن نگار نور اور کہکشاؤں کے باہمی فاصلوں کی خبر دی گئی ہے۔دائموس کی گردشوں اور گھومنے کا تذکرہ ہے۔اس میں کائنات کی وسعت ابد پناہ کو اک ترنگ ، اندھیری کائنات کو اک امنگ اور منزلوں کو مسحور کن روشنیوں میں ڈوبی راہوں کا نشاں کہا گیا ہے۔دائموس کی زندگی اس کے ناچنے اور جھومنے میں ہے۔اس کے روم روم میں شعلے اور انگ انگ میں آگ ہے۔یہ آگ اگر ٹھنڈی ہو جائے تو دائموس کی موت کا اعلان ہو جائے۔مریخ کے چاند دائموس (قریب ترین)اور فیبوس(فوبوس،) کے حوالے سے مجید امجد نے جن امور کی جانب اشارہ کیا ہے وہ قارئین کو ان کی سیارہ شناسی کا پتہ دیتے ہیں۔

کائنات کی اتھل پتھل میں گرداں دھوئیں کے لشکر زمانوں تک زہریلے اندھیرے پھیلاتے رہے ، تباہی اور معدومیت کے سلسلے بڑھتے رہے تاہم عمیق اندھیریوں میں فیبوس جیسے دیے جلتے رہے۔ان کی لویں امر اجالوں کی حامل تھیں ان سے زندگی کی منڈلیوں میں گل رنگ روشنیاں طلوع ہوئیں۔

اُرناؤس سورج کے گرد گرداں تین ارب مربع میل سے زائد کا حجم رکھنے والا ساتواں سیارہ ہے ۔اس کے آٹھ چاند ہیں۔اس کی کشتی مجید امجد کو بھنور بھنور چلتی نظر آئی ۔اس کی گردش پیہم میں ساحل اور کنار ا نہیں ہے یہ ایک پھیلتا بڑھتا دھارا ہے ۔اس میں طرح طرح کی رتوں اور رنگوں کے میلے ہیں۔اس کے سامنے باقی کئی اجسام تنکوں کی مانند ہیں۔اس سیارے کی ڈوبتی ابھرتی نوکا اپنے وجود کے وسیلے سے اپنے من کی بانی سنا رہی ہے۔ پلوطو ارناؤس کی طرح ایک اور نو دریافت شدہ سیارہ تھا۔اس کے سیارہ ہونے پر شک بھی کیاگیا لیکن اب اسے نظام شمسی کا ایک سیارہ مانا جا رہا ہے۔اس کی چمک کو مجید امجدنے بنیادی اہمیت دی ہے اور کہا ہے اندھیری رات کے اندھیروں کو دور کرنے کے لیے اس کی چمک کی ضرورت ہے ۔انسان کو شام و سحر کی اوٹ سے ہر دم،پیہم گھورنے والے طوفانوں کا سامنا ہے۔مجید امجد نے تیرگیوں کے فتنوں میں گھرے عالموں کے لیے روشنی کی تمنا کی ہے اور کہا ہے اے پلوطو چمکو!اور ایک ایک پل کو سکھ عطا کرو۔غموں کے شعلوں کو اپنی چمک سے بجھاؤ! یہ سیارہ انہینآتے ہوئے قرنوں کے تبسم سے معمور دکھائی دیتا ہے۔وہ کہتے ہیں ہستی کی اندھیری رات میں اس کا دمکنا اور چمکنا روشن سکھ کے لیے ہے۔

مریخ اور اس کے دو چاندوں اور پھر ارناؤس اور پلوطو سیاروں کا تذکرہ کرنے کے بعد مجید امجد اپنی نگہ کے مرکزکرۂ ارض کی جانب پلٹتے ہیں۔زمین پر انہیں عکس خاک اور رقص نور نظر نہیں آتا ۔ تہذیبی تاریخ میں موجود ''وادی ایمن'' اور'' شمع طور'' ۳موجود نہیں اور پاکیزہ اقدار راکھ میں غلطاں دکھائی دیتی ہیں۔ مئے طہور کی عدم دستیابی کے ساتھ ساتھ شیشۂ افلاک بھی چور چور ہے۔زمین پر انسان جہالت اور ظلم کے جن اندھیروں میں گھرا ہے۔انسان کو اس ابد کی پینگ کی جانب سفر کرنا ہے۔اس لیے مقدروں کے جہاں در جہاں اندھیروں میں اس کے بے صبر شوق کو بھٹکنا نہیں ہے ۔انسان کی زندگی میں اگر اضطراب مسلسل کی خوں چکاں گھڑیاں نہ ہوں تو زندگی منجمد ہو جائے۔اس کے وجود کو سیاروں کی طرح متحرک رہنا ہے۔انسان کو دنیا میں سرور اور سکھ کی ضرورت ہے۔ اگر زمین پر زندگی نہ رہے تو تو ہستی کے سب سلسلے ختم ہو جائیں گے۔شاعر امید کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتا ۔اور کہتا ہے ''ہر بجھی روح کے آنگن میں کھلا ہے چمن امکانات'' ۴۔انسان نے اس چمن کی جانب بڑھنا ہے۔اگر زندگی ہے تو سلطنت غم اور اقلیم طرب کی پروا کیے بغیر آئین جہاں بانی جاری رہے گا۔ سیاروں اور ان کے چاندوں کا علامتی تذکرہ شاعر کو اس نتیجے پر پہنچاتا ہے کہ انسان کو بھی حرکت میں رہنا ہے۔اسے اپنے ارد گرد تیرہ افق گھٹاؤں کو اپنے وجود کی مضطرب اور ناصبور چاندوں جیسی روشنیوں کی مدد سے'' خنک موج اور خماریں جھونکے ''۵پیدا کرنے ہیں۔مجید امجد نے کار جہاں کو بہتر بنانے کے لیے کائناتی اضطراب سے حوصلہ لیا ہے ۔شاعر نے جو درد و غم جمع کر رکھے ہیں اور اس کے جو مشاہدے اور فسوں کار یادیں ہیں وہ ان کے بارے میں اپنی '' تمناؤں کے تصویر کدے میں نگراں بیٹھا''

۶صفحۂ صد رنگ رموز کونین سے حاصل شدہ دانش و فکر سے ایک مصور کی طرح تصویر سازی کرتا چلا جا رہا ہے۔

مجید امجد نے ''نہ کوئی سلطنت غم ہے نہ اقلیم طرب '' ۷کے ابتدائی مرصع حصوں میں انسان کی شجر ممنوعہ کا پھل چکھنے کی لغزش کی بات کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس کی وجہ سے انسان کے ہاتھ سے امنگوں سے چھلکتی دنیا جاتی رہی۔اور افسوس یہ ہے کہ انسان اس دنیا کو کھو کے پھر پا نہ سکا۔اس نظم میں ، واحد متکلم بطور انسان سامنے آتا ہے۔مجید امجد کائنات میں موجود دنیاؤں کی ارزانی یا کثرت کا تذکرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ کائنات کے خلاؤں میں ستارے، خورشیداور ماہ بھی بہتات میں ہیں۔اور یہ بھی کہتے ہیں کہ کسی کو معلوم نہیں کہ زمانے کے سمندر کی وسعت اور تھاہ کتنی ہے لیکن انسان اس بات پر افسردہ ہے کہ وہ اپنی کھوئی ہوئی دنیا کو پانے سے قاصر رہا ہے۔اسی دنیا کے چھن جانے انسان کو پریشان کر رکھا ہے۔اس دنیا کی انسان نے بہت تلاش کی لیکن وہ نظروں سے گریزاں رہی اور اس کے نہ ملنے سے '' اک رنج پشیماں نگہی''۸ اس کی تقدیر کی پلکوں کا بوجھ بنا رہا۔ اب انسان کا دل '' عالم حیرانی'' ۹میں ہے۔اب انسان کے سامنے ایک ایسی دنیا ہے جس میں جدو جہدہے غموں خوشیوں کے جھمیلے ہیں۔انسان کے سامنے یہ دنیا گراں جانی کے مصحف کا ایک ورق ہے۔ مجید امجد کا کہنا ہے۔انسان کی لغزش پا نے اسے ابدی زندگی کی جگہ اسے موت کے ذائقے سے ہمکنار کیا۔یوں اسے'' سلسلۂ زندگی فانی'' کو سینے سے لگانا پڑا۔اس کے حصے میں اب ''ساعت محرومی غم تاب'' ۱۰ہے۔وہ سوال کرتے ہیں کہ:

لاکھوں دنیاؤں کے لٹتے ہوئے کھلیانوں سے
میرا حصہ یہی میری تہی دامانی ہے ؟
کیا اسی واسطے ماضی کے یخستانوں سے اک موج حیات
اپنے ہمراہ لیے ناچتی گاتی ہوئی صدیوں کی برات
آ کے اس ساحل گل پوش سے ٹکرائی ہے ؟
کیا یہی مقصد صد عالم امکانی ہے
کہ جب اس سطح خروشندہ پہ ڈھونڈوں میں کوئی رخت طرب
کوئی مکھ، کوئی نگہ، کوئی تبسم، کوئی جینے کا سبب
آسمانوں سے صدا آئے "تو کیا ڈھونڈتا ہے
تیرا ساماں تو یہی بے سر و سامانی ہے" (۱۱)

انسان کو جنت کا سرو ساماں چھوڑ کر زمیں پر حیات فانی اور بے سرو سامانی کا سامنا ہے۔مجید امجد کہتے ہیں کہ عقل اس بات پر حیران ہے کہ حریم اسرار کے طرفہ پردوں میں سے انسان کو راحت و غم کے عقدے ، جہان گل و خار کے راز اور ''پا بہ زنجیر ارادوں کا خروش پیہم''۱۲ میسرآیا ہے۔شاعر استفسار کرتا ہے کہ کیا زمین کہ جو اب معمورہ انسانی ہے اس کا مستقبل یہی ہے۔ زمین پر انسان کے مسائل کے حوالے سے ہر حساس شاعر نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے ۔اور اس حوالے سے اس کی ناپائیداری اور بے سروسامانی کو بھی موضوع بنایا ہے۔میر تقی میر سے لے اقبال تک تمام شاعروں نے انسانی زندگی کے فانی ہونے اور بے سرو سامان ہونے کی نشاندہی اور توضیح کی ہے۔

مجید امجد کی شاعری میں جن انواع کے فکری ، سماجی اور مابعد الطبیعیاتی سوالوں سے سروکار رکھا گیا ہے وہ تلاش، تشکیک اور ایقان کی منزلوں کی نشاندہی کرتے ہیں۔انہوں نے بطور ایک مفکر غایت حیات انسانی پر مستقل غور و خوض کیا ہے۔کائنات کیا ہے؟ کائنات بنانے والی ہستی کا کائنات بنانے کا منشا کیا ہے؟ کیا انسان کی کوئی مستقل منزل ہے۔کیا اس کے سفر ہستی کا کوئی حاصل ہے؟تلاش حقیقت کے عمل میں مجید امجد منزل تحیر سے گزرے۔مادی فلسفوں اور علموں کے مطالعے نے ان کے اندر ایک نوع کی تشکیک کو جنم دیا۔انہیں آسمانی بلندیوں اور زمینی پستیوں کے مقاصد و مفاہیم پر سوال

اٹھانے کی جرآت کرنا پڑی۔تاہم کائنات کی وسعتوں میں انہیں گہرے اندھیرے نظر آئے ۔ان اندھیروں کو دور کرنے کے لیے ’’کوئی مشعل بھی نہیں، کوئی کرن بھی تو نہیں‘‘ ۱۳۔’’شب اندھیری ہے ، گھٹا ٹوپ ہے ، طوفانی ہے‘‘ ۱۴ ۔مجید امجد کہکشاں کے تحیر کدے میں موجود یہ سیاروں اور مہتابوں سے زمین پر انسان کی حالت زبوں کے حوالے سے استفسار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ انسان کو اس زمین کے اندھیروں کو دور کرنے کے لیے سورجوں اور روشنیوں کی ضرورت ہے ۔َََََََََََِایسے میں ایک وجودی کرب سے شاعر نعرہ زن ہوتا ہے ’’میں کہاں جاؤں، کہاں جاؤں، کہاں جاؤں، کہاں؟‘‘ ۱۵اس رویے کا سبب یہ ہے:

میں نے اک عمر اسی معمورۂ ظلمات میں رقصاں، جولاں
ہر قدم اپنے ہی قدموں کی صداؤں سے گریزاں، لرزاں
جگر جام سے چھینے ہوئے نشّوں میں مگن
خاک ان راہوں کی یوں خاک بہ سر چھانی ہے
جس طرح ایک سہارے کی تمنا میں کسی ٹوٹتے تارے کی حیات
مہ و انجم کے سفینوں کی طرف اپنے بڑھائے ہوئے ہاتھ
خم افلاک سے ٹکرا کے بھسم ہو جائے
(ان خلاؤں میں کسے تاب پرافشانی ہے !) ۱۶

انسان کو دنیا میں جنت کی تلاش ہے ۔اس جنت کی کہ جسے وہ کھو چکا ہے۔وہ اسے دوبارہ حاصل کرنے کے جتن میں مصروف ہے۔مجید امجد اس منطق پر تجزیاتی نظر دوڑاتے ہیں اور یہ سوال اٹھانے میں بھی گریز نہیں کرتے کہ ہمارے تصورات میں جس برتر ہستی کے حوالے موجود ہیں کہیں ایسا تو نہیں وہ موجود ہی نہ ہو:

کس کی فتراک میں ہیں عرش بریں، فرش زمیں؟ کون کہے
پس صد پردۂ افلاک کوئی ہے کہ نہیں؟ کون کہے ــــــ
جانے کن گہرے دھندلکوں سے ضیا پاتی ہے
درحقیقت یہ حقیقت کی جو تابانی ہے
اتنے زخموں سے سجا کر دل بے تاب کی پژمردہ جبیں ـــــ
کس نے بھیجا ہمیں اس جلتے ہوئے دیس میں؟ معلوم نہیں!
یوں نہ اپنے دم امید کو بہلائے کوئی
کون کہتا ہے گلستان میں بہار آنی ہے (۱۷)

اس پس منظر میں یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

’’وہ انسان جس کے پاس سب کچھ موجود تھا جو خوش باش رہتا تھا اور جس نے کوئی ضرورت اور پریشانی محسوس نہیں کی تھی اور جس کی رسائی فقط مسرتوں اور عنائتوں تک تھی اسے بتایا گیا کہ وہ ممنوعہ ثمر نہ چکھے۔ لیکن اسے شیطان نے بہکایا اور اس نے چکھ لیا۔ اس نے پہلی دفعہ غور و فکر کیا۔ یہ بہت واضح ہے کہ وہ شجر کیا تھا۔ یہودی اور اسلامی مفسروں کی یہ ثابت کرنے کی کوششیں بے کار گئیں کہ وہ سیب کا درخت تھا یا دانہ گندم تھا یا کچھ اور۔قرآن میں یہ بہت واضح ہے کہ جب انہوں نے ثمر چکھا۔ خدا نے ان سے ملنا چاہا۔ اس نے انہیں بلایا لیکن وہ نہیں آئے۔ انہوں نے کہا کہ انہیں اپنے جسموں سے شرم آتی ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ اس سے پہلے وہ اپنی بدصورتی اور شرم سے آشنا نہیں تھے۔ یہی ان کے خوش باش رہنے کا سبب تھا وہ اسی وجہ سے جنت میں تھے۔ یہ قرآن اور عہد نامہ عتیق میں واضح اور براہ راست انداز میں بیان ہوا ہے کہ یہ ادراک اور شعور کا ثمر تھا۔ قرآن میں اس حوالے سے گہرے اشارے موجود ہیں۔ اس کی اصل عبارت سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ جونہی انسان نے اس ممنوعہ ثمر کو چکھا تو جنت کا منظر زمینی مصائب کی دنیا سے معمور ہوگیا اور وہ انسانی ضرورتوں سے چھوٹی نظر آنے لگی۔ زمین پر

پھینکنے جانے اور راندہ درگاہ ہونے کا یہی مفہوم ہے۔ باغ عدن زمین پر ہے اور وہ یہی زمین ہے۔ ہمیشہ کی طرح اب بھی ہم دیکھ سکتے ہیں کہ دیگر انسان جتنا اس پھل کو (شعور کو)چکھتے ہیں انہیں احساس ہوتا ہے کہ دنیا میں ان کی زندگی اتنی ہی تنگ ہے وہ دوسروں کے غیر مناسب رجحانات کو محسوس کرنے کے بعد زیادہ پریشان ہوتے ہیں۔ "(۱۸)

انسان دنیا میں اپنے اشرف المخلوقات ہونے پر نازاں ہے۔اسے اس بات پر بھی فخر ہے کہ وہ کسی اور درگاہ کی مخلوق ہے تاہم اسے اس کی حکم عدولی کی بنا پر کائنات کی وسعتوں میں گرداں ایک دور دراز سیارے پر پھینک دیا گیا ہے۔وہ زمین پر ایک اجنبی مخلوق کی طرح زندگی بسر کر رہا ہے۔اس کا وطن یا اس کی درگاہ کہیں اور ہے۔اس مابعد الطبیعیاتی تصور پر نوع انسان کی کثیر تعداد یقین رکھتی ہے کہ یہ تصور پیغمبروں پہ نازل ہونے والے صحیفوں میں بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔اس کا لب لباب یہ بھی ہے کہ اس دنیا سے اس کی واپسی بھی ہو گی اور وہ ایک روز اپنی درگاہ کی جانب بھی لے جایا جائے گا۔انسان کی پیدائش کے بارے میں مادی علوم کا نقطہ نظر یہ ہے کہ یہ نہ تو کسی اور دنیا سے آیا ہے اور نہ ہی اس نے کسی اور دنیا کی جانب لوٹنا ہے۔اس کا ملجا و ماویٰ یہی زمین ہے۔زمین پر انسانی سفر کی کہانی بڑی طولانی ہے۔کائنات کے ریگستان کی وسعتوں میں زمین کی اپنی حیثیت کیا ہے؟ یک ذرہ! اس میں انسان کے سفر کی کہانی اس کے غموں کی شکن آلود بساط کی کہانی ہے ۔یہ کہانی انسانی تاریخ کے ہر مرحلے پر اسے در پیش رہی ہے۔مجید امجد نے بطور شاعر نوع انسانی کے دکھوں کو اپنی نظموں میں منتقل کرنے کا جو شعور خیز کام کیا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اس مخلوق کی زمین پر بیگانگی کا اعتراف کرتے ہیں اور اسے تنہا اور اکیلا سمجھتے ہوئے اس پر ٹوٹنے والے عذابوں کی تصویر کشی کرتے ہوئے کہتے ہیں :

دیکھتے ہو وہ جو اک جادۂ نورانی ہے
وہ جو اک موڑ ہے اور وہ جو جھروکا ہے سر بام بلند
کبھی پہنچی نہیں جس تک سحر و شام کے سایوں کی کمند
وہ جو جھکتی ہوئی، مڑتی ہوئی دیواریں ہیں
جن کا منصب انھی گلیوں کی نگہبانی ہے
وہ جو ہر شام انھی گلیوں میں کوئی مست سی لے
بند ہوتے ہوئے دروازوں کے آہنگ میں گھل جاتی ہے
وہ خموشی، سفر شب کے تسلسل کی نقیب
جس کی میّت پہ اندھیروں نے ردا تانی ہے (۱۹)

انسان کو معروضی خلا کا سامنا ہے، اسے موضوعی خلا کا سامنا ہے، اسے تنہائیوں کا سامنا ہے، اسے بیگانگی کا سامنا ہے۔دنیا میں وہ بے یارو مددگار ہے۔اسے اپنے عذابوں کا خود ہی سامنا کرنا ہے۔وہ کبھی کبھار پکار اٹھتا ہے اے میرے رب تو نے مجھے کیوں چھوڑ دیا ہے۔میں کرہ ارض پر تنہا ہوں۔مجھے سہارے کی تلاش ہے۔انسان کی عمر اسی معمورۂ ظلمات میں اپنے ہی قدموں کی صداؤں سے گریزاں راہوں کی خاک یوں چھانتی جیسے کوئی ٹوٹتا تارہ کسی سہارے کی تلاش کرتا ہوا فنا یاموت کی خلاؤں میں گم ہو جاتا ہے۔ مہاتما بدھ نے حیوانی اورانسانی زندگی پر ہونے والے مظالم کو دیکھ کر اپنی اصل سلطنت کو خیر باد کہہ دیا تھا۔گیان کی تلاش میں کپل وستو کا شہزادہ سلطنت غم اور اقلیم طرب سے ماورا انسانوں کو دکھوں سے نجات دلانے کا فریضہ سنبھالتا ہے۔حقیقی شاعر کو بھی یہی فریضہ ادا کرنا پڑتا ہے۔وہ اپنے احساس کا جلتا ہوا زہر پیتے پیتے اک عمر کاٹ دیتا ہے۔مجید امجد کہتے ہیں:

تب میں سمجھا کہ یہ راہیں، یہ گھروندے ، یہ پھبکتی دنیا
اب یہ سب کچھ غم جاوید کی اک دھڑکن ہے
اب یہی زخم ہیں اور شغل مگس رانی ہے
آج بھی جب کہیں رستے میں، کسی موڑ، کسی منزل پر

کسی دیوار سے کنکر بھی پھسل جاتا ہے
کوئی دامن کہ جسے ناز گل افشانی ہے
دھوپ میں سوکھتی خرما کی چنگیروں سے بھرے کوٹھوں سے
ایک پل کے لیے اڑتا ہے ، سمٹتا ہے تو دھیرے دھیرے
کوئی لے سی مرے احساس میں بھر جاتی ہے
تار بربط کی کوئی لرزش پنہانی ہے
جو شب و روز کے ایواں میں فغاں بن کے بکھر جاتی ہے
آسمانوں سے ، زمینوں سے کسی دل کے دھڑکنے کی صدا آتی ہے
کوئی چپکے سے مرے کان میں کہہ جاتا ہے
سنتے ہو، کس کی یہ آواز ہے ، پہچانی ہے ؟(۲۰)

انسان کی لغزش پا زمین پر تواتر کے ساتھ جاری ہے۔اسے اس کرے پر جن دکھوں کا سامنا ہے وہ حساس شاعر کے دل کا داغ بنے ہیں۔وہ دردمندی سے ان پر اظہار خیال کرتا ہے اور انسان کو ان حکم عدولیوں سے روکنا چاہتا ہے کہ جن کی وجہ سے اس کی زندگی مزید اجیرن ہو جاتی ہے۔ مہاتما بدھ کا قول ہے: ''جھیلوں کے علاقے میں جزیرہ ہونا'' ناقابل معافی جرم ہے ۲۱۔ شاعر یہ جرم کر سکتا ہے کہ اس کے ذمے زندگی کے پہیے کو اخلاقی ترقی کی جانب لے جانے کا کام ہے۔شاعر کو تاریخ کے پہیے کو آگے بھی لے جانا ہوتا ہے۔زمین پر انسان نے جو انسان کو دکھ پہنچانے والا نظام قائم کیا ہے ۔شاعر اسے بھی چیلنج کرتا ہے۔ وہ سماجی حقائق کا تجزیہ کرتا ہے اور اس فانی دنیا میں بھی بے سرو سامان انسانوں کو دنیاوی سرو سامان رکھنے والے انسانوں کے مظالم سے بچانے کے لیے بھی جدو جہد کرتا ہے۔وہ جھیلوں کے علاقہ میں جزیرہ بن کر کذب و جبر کی اقلیم کی نشاندہی کرتا ہے اور یہ نشاندہی سچ اور آزادی کے تصورات کو سینے سے لگائے بغیر ممکن نہیں۔

جی میں آئی ہے کہ اک بارغم زیست پہ احساں دھر کر
دیگ گردوں میں ابلتے ہوئے زہراب سے اک خُم بھر کر
(دیگ گردوں کہ ابد زنگ شکم میں جس کے
کھولتے دردوں کا ہنگامۂ لافانی ہے)
اسی زہراب سے خُم بھر کے پٹخ دوں افق دوراں پر
آگ ہی آگ برسنے لگے اس پھولوں بھرے بستاں پر
اب یہی دھن ہے کہ اس ظلمت بے پایاں کو
جو مری روح کے ایوان کی زندانی ہے
اٹھ کے پھیلا دوں انہی اونچے درختوں سے ڈھکی راہوں پر
انھی گدرائی ہوئی دھوپ میں لہراتی چراگاہوں پر
اب ارادہ ہے کہ ان بس بھرے ارمانوں کو
جن کے سایوں میں مری زیست کی ویرانی ہے
گھول دوں جھومتے جھونکوں کے چھلکتے ہوئے پیمانوں میں
سینۂ دشت پہ بجتی ہوئی شہنائیوں کی تانوں میں
چاہتا ہوں کہ یہ زیتون کے جنگل کا سکوت
جس کی وسعت ہے کہ اک عالم حیرانی ہے
میری کھوئی ہوئی دنیاؤں کے کہرام سے تھرّا اٹّھے ___
اب یہ ٹھانی ہے کہ جمتی ہوئی بوندوں کے یہ بیکل چھینٹے
تیز جھالوں کے یہ چابک سے کہ جن کی زد پر
کبڑے رستوں کی تھکی پیٹھ کی عریانی ہے
یہ دھواں دھوپ ترائی، یہ دھواں دھار پہاڑوں کی فصیل
دور تک چوٹیوں اور بدلیوں کے دیس کی سرحد جمیل

برف سی بدلیاں، جن کے لب تر سے پیوست
برف کی چوٹیوں کی دودھیا پیشانی ہے
ہاں یہ سب سلسلۂ رنگ، یہ گہوارۂ حسن و افسوں___
میں اسے اپنی دکھی روح کی ان راگنیوں سے بھر دوں
جن کی لہریں کبھی آنسو ہیں، کبھی آہیں ہیں
جن کی تقدیر کبھی آگ، کبھی پانی ہے (۲۲)

شاعر ہر نوع کے حالات کا سامنا کرتا ہے ۔وہ زندگی کی اقدار کو آگے بڑھانے کا کام کرتا ہے۔تاہم اسے اپنے ارد گرد کے حالات پر بھی گہری نظر ڈالنی پڑتی ہے۔مجید امجد کی نظم ''نہ کوئی سلطنت غم ہے نہ اقلیم طرب'' ۲۳میں مابعد الطبیعیاتی حوالوں سے جو باتیں ہیں ان سے قطع نظر زمین پر انسان کو جن دکھوں کا سامنا ہے اس پر شاعر کا نقطہ نظر مثبت ہے۔وہ انسان کے شعور کے بہتے دھاروں کے آگے بند باندھنے کی کوششوں کی تائید نہیں کرتے۔ شاعر اپنے عہد کی تاریخ پر نظر رکھتے ہوئے انسان کی جن لغزشوں کی نشاندہی کرتا ہے ان سے بچ کر زمین پر انسان کی زندگی کو بہتر بنایا جا سکتا ہے۔

مجید امجد کی نظم ''نہ کوئی سلطنت غم ہے نہ اقلیم طرب'' ۲۴انسانی تاریخ کی حکایت بھی کہتی ہے اور شاعر کے اپنے زمانے کی بابت بھی معلومات مہیا کرتی ہے۔انسان کائنات اور فطرت کی بڑی طاقتوں کے گرجتے ہوئے طوفانوں میں اپنی پلکوں پہ امنگوں کے دیے لے کے کسی نغمۂ شیریں کی بہار کا منتظر تھا۔وہ چاہتا تھا اس کی تنہائیاں اور ویرانیاں ختم ہوں۔اور وہ نئی کونپلوں اور کلیوں کے روبرو زندگی گزار پائے۔شاعر کا خیال ہے کہ اس کے باغوں میں کلیاں مہکی تھیں ۔لیکن اسے اس اک لمحۂ نایاب کے کھو جانے کا غم ہے جو اس کے لیے ''حاصل سلطنت عالم امکانی'' ۲۵تھا۔اس نظم میں مستقبل کے سہانے خواب دکھانے کے لیے بحر کی تبدیلی کے ساتھ مجید امجد دنیا میں موجود عذابوں کے خلاف رد عمل کا اظہار کرتے ہیں اور اپنے سنگی ساتھی سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں:

یوں کب تک صبح و شام جلیں
بے سود جلیں، ناکام جلیں
جب دنیا والے سو جائیں
میٹھے سپنوں میں کھو جائیں ----
جب چلتے دریا تھم جائیں
تاروں کی نگاہیں جم جائیں
جب آگ بجھے چوپالوں کی
جب آنکھ لگے رکھوالوں کی
دیوار و در سے چمٹتے ہوئے
دو بھک منگوں کے بھیس میں ہم
جا نکلیں اک اور دیس میں ہم
کچھ دور، افق کے پار، اُدھر
ہے ایک نیا سنسار اُدھر
خوشیوں کی، سنگاروں کی دنیا
پھولوں کی، بہاروں کی دنیا (۲۶)

وجودیت نے انسان کو جس نوع کی لامعنویت کا اسیر پایا ہے اس میں تمام مابعد الطبیعیاتی سہارے اس کا ساتھ چھوڑ چکے ہیں۔اسے بطور تنہا وجود اپنی جوہر سازی کے عمل سے گزرنا ہے۔پہلے سے طے شدہ جوہر کی مذہبی وجودیوں نے تو بات کی ہے لیکن دہری وجودیوں نے دنیا کے عدم میں انسانی وجود کے لیے ضروری قرار دیا ہے کہ وہ یہاں اپنے ارادے کو بروئے کار لائے، اپنے فکر کے وسیلے سے اپنے معنی کا تعین کرے۔مجید امجد کا یہ سوال کہ ''میں کہاں جاؤں، کہاں جاؤں، کہاں جاؤں، کہاں؟'' ۲۷ شاعر کی اس بیگانگی کی جانب اشارہ ہے جس کا سامنا

اسے زمین پر اپنی موجودگی کی بدولت ہے۔وہ افق کے پار کسی اور سنسار کی تلاش میں ہے۔یہ رومانوی رویہ اسے احساس دلاتا ہے کہ وہ اس زمین اور سماج کے روبرو ایک اجنبی کی طرح زندگی بسر کر رہا ہے۔اس کی بے ارادہ زندگی اور اس کی بے اختیار موت اس کے اعمال کے تعین کا باعث ہے۔اس کا انتخاب اس کے اختیار میں نہیں ہے ۔اس کی آزادی اگر اسے مل بھی جاتی ہے تو اس کی حد موت تک ہے۔ تاہم اس کے باوجود مجید امجد نے اپنی زیر بحث نظم میں قدیم مابعد الطبیعیاتی تصورات کے خلاف اپنے شدید رد عمل کا اظہار کیا ہے۔ یہ شاعر کی وجودی آزادی کا تقاضہ تھا۔وہ تصوراتی اقلیم طرب کی جانب رجوع کرتے ہوئے اس کے ناموجود ہونے کا شعور بھی رکھتا ہے۔ اس لیے اسے معلوم ہے کہ زندگی کی سلطنت غم سے نجات موت کے وسیلے سے ہی ممکن ہے۔ شاعری کے حوالے سے علامہ اقبال کہتے ہیں:

جوئے سرود آفریں آتی ہے کوہسار سے
پی کے شراب لالہ گوں مے کدۂ بہار سے
مست مے خرام کا سن تو ذرا پیام تو
زندہ وہی ہے کام کچھ جس کو نہیں قرار سے
پھرتی ہے وادیوں میں کیا دخترخوش خرام ابر
کرتی ہے عشق بازیاں سبزۂ مرغزار سے
جام شراب کوہ کے خم کدے سے اڑاتی ہے
پست و بلند کرکے طے کھیتوں کو جا پلاتی ہے
شاعر دل نواز بھی بات اگر کہے کھری
ہوتی ہے اس کے فیض سے مزرع زندگی ہری
شان خلیل ہوتی ہے اس کے کلام سے عیاں
کرتی ہے اس کی قوم جب اپنا شعار آزری
اہل زمیں کو نسخۂ زندگی دوام ہے
خون جگر سے تربیت پاتی ہے جو سخنوری
گلشن دہر میں اگر جوئے مے سخن نہ ہو
پھول نہ ہو، کلی نہ ہو، سبزہ نہ ہو، چمن نہ ہو (شاعر) (۲۷)

ہولڈرلن کی شاعری پر اظہار خیال کرتے ہوئے ہیڈیگر نے زبان کو شاعر کا بنیادی ہتھیار سمجھا تھا ۔زبان کو بھی وہ شاعری سمان خیال کرتا ہے ۔اس کا خیال ہے کہ شاعر زبان کے وسیلے سے اشیا کو نام دیتا ہے اور اپنے وجود کی بنیادوں پر اپنے آپ کو مجتمع کرتا ہے۔شاعری کو ایک معصوم عمل قرار دیتے ہوئے وہ کہتا ہے کہ وہ تمثالوں کی دنیا میں لفظوں سے کھیلتا ہے۔زبان کو ہیڈیگر ایک خطرناک ہتھیار بھی کہتا ہے۔یہ شاعر کے زمانے سے تعلق رکھتا ہے۔شاعر کی گفتگو دیوتاؤں کو نام دینے کی مانند ہے۔شاعر اپنی زبان میں اپنے وجود اور زمانے کو مجتمع کرتا ہے۔شاعر جو کچھ کہتا ہے لفظوں میں اور لفظوں کے وسیلے سے کہتا ہے۔شاعری اس کے وجود کی مظہر ہے۔شاعرکاشاعرانہ اظہار اس امر کا غماز ہے کہ انسان شاعرانہ تفکر سے کام لیتے ہوئے انسانوں اور دیوتاؤں کے مابین رابطے کا باعث بنتاہے یوں شاعری ایک سنجیدہ عمل کے بطور سامنے آتی ہے اسے شغل اشغال کی چیز نہیں سمجھنا چاہیے۔شاعری تاریخ کے دائرے میں آ کر ثقافت محض سے بلند ہو جاتی ہے۔مجید امجد کے لیے اسنکی شاعری ان کے وجود کا اظہار تھی۔وہ ان کے زمانے اور تاریخ کا بیان ہے۔اسے شاعر کے وجود کی معنوی تشکیل کا باعث جاننا چاہیے۔مجید امجد نے اپنی تنہائی اور بیگانگی کو تخلیق فن کے وسیلے سے دور کرنے کی کوشش کی۔

حوالے

(۱) مجید امجد، *کلیات*، ترتیب،خواجہ محمد زکریا، دہلی: فرید بک ڈپو، ۲۰۱۱، ص ۲۸۶
(۲) ایضاً، ص ۲۹۵

(۳) ایضاً، ص ۲۹۸
(۴) ایضاً، ص ۲۹۹
(۵) ایضاً، ص ۲۹۹
(۶) ایضاً، ص ۲۹۹
(۷) ایضاً، ص ۲۸۶
(۸) ایضاً، ص ۲۹۰
(۹) ایضاً، ص ۲۹۰
(۱۰) ایضاً، ص ۲۹۰
(۱۱) ایضاً، ص ۲۹۱
(۱۲) ایضاً، ص ۲۹۱
(۱۳) ایضاً، ص ۲۹۴
(۱۴) ایضاً، ص ۲۹۴
(۱۵) ایضاً، ص ۲۹۴
(۱۶) ا یضاً، ص ۲۸۷
(۱۷) ا یضاً، ص ۲۹۱
(۱۸) علی شریعتی، (مضمون) فن اور مسیحا انتظاری ، *تخلیق مکرر*، لاہور: جی سی یونیورسٹی،۲۰۰۹ء، ص۷۷
(۱۹) ا یضاً، ص ۲۸۸
(۲۰) ا یضاً، ص ۲۸۷
(۲۱) سعادت سعید، *تعارف ، تہذیب، جدیدیت اور ہم* (ترجمہ)، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۷ء،ص۸
(۲۲) مجید امجد، *کلیات*، ترتیب،خواجہ محمد زکریا، دہلی: فرید بک ڈپو، ۲۰۱۱، ص ۲۹۳
(۲۳) ا یضاً، ص ۲۸۶
(۲۴) ا یضاً، ص ۲۸۶
(۲۵) یضاً، ص ۲۸۸
(۲۶) ا یضاً، ص ۲۸۹
(۲۷) علامہ اقبال، *کلیات اقبال* (اردو)، لاہوراقبال اکادمی،۱۹۹۰ء،ص ۷۷